

پس نوآبادیات: مشرق کی بازیافت کی تحریک

امتیاز عبدالقادر

ریسرچ اسکالر، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

POST COLONIALISM A REVIVAL MOVEMENT OF ORIENT

Imteyaz Abdul Qadir

Research Scholar, Kashmir University, Srinagar

Abstract

Post colonial trend in literature begins with the resistance against colonial system. This trend got developed in one shape or other in the occupied countries with the start of resistance movement against colonialism. This resistance was all encompassing and could be felt on socio-political and literary levels. This movement is aimed at reversal of colonial system and revival of indigenous values side by side revivification of golden values of the past. There emerged great literary persons committed to this movement in almost all occupied countries and they caused a revolution like effect in the currents of their respective literature. This article focuses the Orient side of the said movement.

Keywords:

مغربی فلسفہ، عقلیت، پس نوآبادیات، ادبی، ثقافتی، ایشیا، افریقا، ڈیکارٹ،
ٹنگور، کیب رال

بیسویں صدی جو اپنے آغاز میں عالم انسانیت کے لیے ہوش ربا چیلنج لے کر آئی تھی آخر ایسی قوتوں کے ظہور سے ہم کنار ہوئی جو اس چیلنج کا بخوبی سامنا کر کے دنیا کو نیا رخ دے رہی تھیں۔ اس صدی میں مغرب نے مادیت کو ایک کاہوس کی طرح عالم انسانیت پر مسلط کر دیا تھا جو طرح طرح کے انسانیت دشمن فلسفوں کا سہارا لے رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں مغرب کی استعماری ہوس کے بدترین مظاہر، پھر اشتراکیت کا عروج اور بے شمار انسانوں کا قتل، ہٹلر و موسولینی کا فروغ اور جاپان کے خلاف پہلی بار ایٹم بم کا وحشیانہ استعمال، غرض اس صدی کے نصف اول میں انسانیت کے سینے کو چھلنی کر ڈالنے کی تمام کوششیں ان لوگوں نے کیں جو خود کو بے حد ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔ پھر مغرب کی سیاسی قوت کی چٹانیں شکستہ ہوئیں۔ ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو گئی، مگر مغرب کی ذہنی غلامی ختم نہ ہوئی۔ اب میدان جنگ مغرب نے بڑی حکمت سے مشرق کو ہانے کی کوشش کی، کوریا، نہر سویز اور ویتنام کی خون ریز جنگیں ہوئیں اور انسانیت مسلسل ہلاکت اور بربادی کے خطرات سے دوچار رہی۔ انسانیت کو اس خوف ناک موڑ تک لانے والے افکار و نظریات کا ایک سرسری جائزہ مناسب ہوگا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ اُن کا رخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چوں کہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداءً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباتت رہے۔ مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی، حتیٰ کہ خدا کا تخیل اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعی سے بالاتر ہو، اُن سے بالکل غائب ہو گیا اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ حرکت کے سوا کوئی شے اُن کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس، نیچریت کا ہم معنی قرار پا گئی اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو مادی اور تولی نہ جاسکے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ (۱)

ڈیکارٹ (1650ء) مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے، ایک طرف تو خدا کا زبردست

قائل ہے اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالم طبیعی کے آثار کی توجیہ میکائیکی طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنیاد رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (1679) اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فوق الطبیعت کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکائیکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے۔ اسی زمانے میں Spinoza اٹھا، جو سترہویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک گُل بنادیا اور اُس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لایبنٹز اور لاک (1716ء اور 1704ء) خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔ (۲)

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپر نیکس، کپلر، گیلیلیو، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علم برداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا لیکن وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خط امتیاز نہ کھینچ سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ دونوں ایک ساتھ بھ سکتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظام کائنات کی جستجو کرے گا، وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ، ڈیوڈ ہارٹلی، ہولباخ، روسو اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ و حکما پیدا ہوئے جنہوں نے اعلانیہ الحاد کی راہ اختیار کی۔ انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوکت، بوخرن، کومت (Comte)، موبشات اور دوسرے فلاسفہ و حکما نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا۔ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی:

”اس کو بد قسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تمام اسلامی

ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے، ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب و داب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ مازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیر حکم آ گئی تھیں۔ ان کو اپنی دنیاوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چوں کہ یہ تحصیل علم خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھا بلکہ ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا.....“ (۳)

غرض خیالات پر خیالات اور نظریات پر نظریات سامنے آتے رہے۔ مغرب نے اسے مایہ ناز سمجھا کہ اپنے خیالات و افکار کو ہر آن تبدیل کرتا رہے، جو چیز پرانی ہو گئی اسے چھوڑ کر نئے رجحانات اور تصورات کا سہارا لے۔ ان کے نزدیک یہ حقیقی ارتقا اور انسانی ذہن و فکر کے نشوونما کی علامت ہے۔ برعکس اس کے ہندوستانی تہذیب ایسے انسان پر بھروسہ کرنے سے منع کرتی ہے جو اپنے خیالات ہر آن بدل رہا ہو، جو صداقت کو مستقل بالذات شے نہ سمجھتا ہو۔ بقول حسن عسکری:

”جو شے مستقل بالذات نہ ہو اسے صداقت کیوں کر کہا جاسکتا ہے۔“ (۴)

پس نوآبادیاتی ادب اور تنقید کا آغاز نوآبادیاتی تسلط کے دوران میں اور بعد ازاں اس کے خلاف مزاحمت کے رویوں اور طریقوں سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ پس نوآبادیاتی رجحان کسی نہ کسی صورت میں اسی وقت سے شروع ہوا جب غلام ملکوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع کیں۔ یہ رجحان تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی سطح پر تقریباً ایک ساتھ ہی شروع

ہوا اور اس کے تحت وہ تمام ممالک آتے ہیں جو تیسری دنیا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پس نوآبادیات کا بنیادی مقصد نہ صرف تہذیبی اور سیاسی سطح پر نوآبادیاتی نظام کو الٹ دینا ہے اور اس کی جگہ مقامی و ذیلی تہذیبی قدروں کا احیا ہے بل کہ اپنے ماضی کی شان دار قدروں کی بازیافت ہے۔

ایڈورڈ سعید (Edward Said) اور دوسرے مفکرین نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسا مانا جاتا ہے کہ نوآبادیات کی شروعات کی مشہور کتاب *Orientalism* سے ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے نوآبادیاتی انداز فکر کو زیادہ مربوط اور منضبط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ سعید (۵) کا ماننا ہے کہ علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی ترقیوں کے پیچھے حکم ران قوم کی اپنی غرض و غایت ہوتی ہے اور اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکم رانی کو مزید استحکام بخشنے۔

پس نوآبادیات ایک علمی، عقلی اور نظریاتی نظریہ ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ جو تحریک ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں چل رہی تھی، جو رہنما نوآبادیات کے خلاف تھے مثلاً گاندھی، ٹیگور، سیسیر، سینکھور، کیب رال، فینن وغیرہ ان کی تحریک نے لوگوں میں انقلاب پیدا کیا اور یہ نظریہ وجود میں آیا۔ (۶) پرمود کے پتھر رقم طراز ہیں (۷):

"Post-colonialism is academic, intellectual, ideological and ideational scaffolding of the condition of decolonization (The period following political independence for nation and culture in Africa, Asia & South America). Post Colonialism as a theory and a critique emerged from within anti-colonial activism & political movements in Asia, Africa & South America. Intellectuals & political leaders among natives.....Gandhi, Cesaire, Tagore, Senghor, Cabral, Fanan were anti colonial activist thinkers whose political views metamorphosed into political & literary cultural theory".

1947ء میں ہندوستان اور 1962ء میں افریقہ کے آزاد ہونے کے بعد Gramsci

اور فو کو نے پس نوآبادیات امور پر توجہ کی تھی لیکن سعید کے گہرے تجزیے کے بعد کچھ بہتر نتائج سامنے آئے، جو بے حد دور رس ثابت ہوئے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پس نوآبادیات اس نظریے کا نام ہے جس کے تحت یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت اور قدیم چیزوں کو منظر عام پر لانا چاہیے نہ کہ اس پر پردہ ڈالنا چاہیے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو کے شعروادب کی نظریہ سازی کے ضمن میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ 1857ء کے بعد کے زمانے میں اردو تنقید مذکرہ نویسی کے دور سے باہر نکلی۔ اسی زمانے میں اردو کے کلاسیکی ادبی سرمایے کے مربوط اور مبسوط جائزے کا سلسلہ شروع ہوا، اور اسی دور میں مغرب کے بعض ادبی نظریات اور تنقیدی رویوں کو عالمی اصول و معیار کی حیثیت حاصل ہوئی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

”اس انداز فکر کے اثرات ہمہ گیر اور دور رس ثابت ہوئے کہ تقریباً سو سال تک اردو کے نظریہ شعروادب میں مغربی فکر واحد تفہیمی طریق کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر کسی نے اردو کی شعری اصناف میں زوال آمدگی کے عناصر تلاش کیے، کسی نے قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کو ازکار رفتہ قرار دیا، کسی نے ہماری شاعری کی سب سے توانا اور مستحکم صنف غزل کو مغربی نظم کوئی کے پیمانوں پر پرکھنے کی کوشش کی، کسی نے اردو شاعری کے بڑے حصے کو جاگیر دارانہ معاشرے کی عکاسی کا نام دیا، کسی نے شاعری کو محض سماجی اظہار کے طور پر دیکھنے کا انداز اختیار کیا اور اس کے رد عمل میں دوسرے حلقے نے ادب میں جنسی اور نفسیاتی محرکات کی اہمیت منوانے کی کوشش کی.....“ (۸)

علاوہ ازیں اردو ادب کے بیشتر تنقید نگار اسی تنقید سے متاثر رہے جس کی شروعات حالی اور شبلی نے کی تھی۔ انگریزی پڑھنے کے ساتھ ساتھ تنقید میں انگریزیت بھی بڑھتی رہی۔ (۹)

عبدالقادری سروری اولین تنقید نگاروں کے بعد دوسرے عہد کے تنقید نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں، جن کی تنقید میں مغرب کا بہت زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے شعر و ادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ارسطو، افلاطون اور میتھو آرملڈ کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ مزید برآں انھوں نے اردو ادب میں کچھ ایسے مباحث کو شامل کیا جو اس سے قبل اردو ادب میں نہیں تھے مثلاً سائنس اور شاعری کی بحث یا رزمیہ اور شاعری کے اقسام پر اظہار خیال۔ ادب میں جدت عیب نہیں بل کہ حُسن تصور کیا جاتا ہے اور چکیلا پن اس کا لازمہ ہے لیکن بقول عبادت بریلوی:

”ان سب میں پروفیسر سروری کے اپنے خیالات کم ہیں اور دوسرے کے خیالات زیادہ ہیں۔“ (۱۰)

تنقید کے مغربی اصول و ضوابط اور شعری مذاہیر نے اردو میں ادبی تفہیم اور تعین قدر کو یقینی طور پر نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ مگر افکار و نظریات کی ہماہمی میں اس بات سے یکسر صرف نظر کیا گیا کہ ادب کے کون سے نظریات ایسے تھے جو ہماری اپنی تہذیب و ثقافت سے اخذ کیے گئے تھے اور ان نظریات میں کون سے ایسے عناصر شامل ہوئے جن کا ہماری ثقافتی قدروں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ (۱۱) مردِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ماہرین و ناقدین کو یہ احساس ہوا کہ اس قدر مغرب کی پیروی مشرقی تہذیب و ثقافت، علوم و افکار اور روایات کے لیے سم قاتل ثابت ہوگی۔ اپنی چیزوں پر نقطہ چینی اور انھیں کم تر سمجھنا اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت سے انکار کے مترادف ہے۔ اس احساس کا نقش اولیں ہمیں سرسید کے یہاں ملتا ہے، اگرچہ ہندوستانی تہذیب اور اردو ادب کی تاریخ کے سیاق و سباق میں سرسید اور ان کے معاصرین کے لیے برطانوی کوششیں غیر معمولی طور پر اطمینان قلب کا باعث تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس تہذیب و ثقافت اور مشرقی روایات کو بچانے کی بات آج ہو رہی ہے اردو میں سرسید نے ہی اس کی شروعات کی تھی۔ سرسید نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تاکہ انگریزی اور دوسرے علوم کی کتابوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کو عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ (۱۲) بعد ازاں عبدالرحمن بجنوری نے

اس کام کو جلا بخشی۔ وہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے، حصول تعلیم کے لیے مغرب کا بھی رخ کیا لیکن ان پر مغربی تنقید و ادب دوسرے طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ وہ اپنی روایات کو کم تر بتانے کے بجائے بہتر بتاتے تھے۔ انھوں نے اپنے مقالہ 'محاسن کلام غالب' میں غالب کا مقابلہ مشرق و مغرب کے مختلف شاعروں اور ادیبوں سے کیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے بجنوری، غالب کو ان سب پر فوقیت دیتے ہیں۔

پس نوآبادیات ایک نہایت جامع اور پیچیدہ تصور اور تنقیدی طریقہ کار کی حیثیت سے پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کی تھیوریز میں تقریباً 1990ء کے آس پاس شامل ہو گیا۔ اس کی رُو سے اُس مغربی فکر و تہذیب کا بطلان کرنا تھا، جس کی تشکیل میں ارسطو، ڈیکارٹ، کانت، ہیگل، مارکس یا پھر ہیومر، دانٹے، کلرچ اور ٹی۔ اے۔ ایلز کی تخلیق کی تحریروں کا نمایاں حصہ تھا اور جو ایک وحدانی تصور کی حیثیت سے ایک آفاقی اور عالم گیر شکل اختیار کر چکا تھا۔ پس نوآبادیاتی ادب اور تہذیب کسی بھی وحدانی فکر کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ اس سے ادب اور دوسری سرگرمیوں میں جنس، تہذیبی تشخص اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مسائل دب جاتے ہیں اور اس کی جگہ *Imperialism* کا ڈسکورس حاوی ہو جاتا ہے۔

پس نوآبادیات کی ترویج و اشاعت میں سعید، ہومی بھابھا اور گائتری نے اہم رول ادا کیا۔ سعید کے مطابق پس نوآبادیات و مابعد جدیدیت ایک دوسرے سے متعلق ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"Both post-colonialism and post modernism emerged as related topics and investigation during the 1980's and in many instances, seemed to take account of such works as Orientalism as antecedents..." (۱۳)

1984ء میں *Sociology of Literature* پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں

سعید، بھابھا اور گائتری نے بھی شرکت کی۔ بھابھا نے جو مقالہ پیش کیا وہ نفسیات سے لے کر

رہنمائی اور مابعد جدیدیت کی تھیوری پر محیط تھا۔ بھابھانے سیاہ اور سفید کی بحث اٹھائی اور سیاہ پر سفید کی بالادستی کے سارے عناصر کو زیر بحث لایا جب کہ گائتری چودھری نے تائیدیت اور ثقافتی مطالعے کے ذریعے مابعد جدید ساختیات رہنمائی، مارکسی نقطہ نظر اور نفسیاتی گرہ کشائی پر کھل کر بحث کی۔ دوسرے شرکانے بھی بڑھ چڑھ کر سیسی مار میں حصہ لیا اور نوآبادیات و پس نوآبادیات کے مسائل اور اس کے اثرات کی کھل کر نشان دہی کی تب سے ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور اردو ادب میں بھی اس جہت سے بحث چل رہی ہے۔ (۱۴)

ایڈورڈ سعید مابعد ساختیات کے علم برداروں کے سائے میں اپنے ذہن و دماغ کی آرائش کرتا رہا ہے، خصوصاً اس پر درپدا اور فو کو کے اثرات تلاش کیے جاتے ہیں۔ اگر کہیں بھی سیکولر تنقید کی گفت کو ہوگی تو اس باب میں سعید کا نام ناگزیر ہوگا۔ اس نے مشرق و مغرب کے ایسے مباحث سامنے لائے جن سے مغرب کی بالادستی اور تشدد کے کتنے ہی پہلو سامنے آتے ہیں۔ سعید کا خیال درست ہے کہ یورپی اور امریکی فن کاروں کے مشرقی مطالعات دراصل مشرق کے استحصال پر مبنی ہیں اور مغربی افکار و آرا ہی مشرقی فکر کو سمجھنے اور دیکھنے کی عقبی زمین ہے۔ یعنی سعید کے ذہن میں یہ بات بہت صاف ہے کہ کس طرح مغربی طاقتیں مشرقی قدروں کو کم تر باور کر کے اپنا احساس برتری قائم رکھنے کی کوشش میں مشغول نظر آتی ہیں۔ مغربیوں کے یہاں مشرقیوں کے لیے جو کچھ بھی ہے وہ اس خیال پر مبنی ہے کہ ہر حال میں مشرق، مغرب کے مقابلے میں ایک ایسی صورت ہے جسے ترقی پذیر ہونا باقی ہے اور یہ ترقی پذیری دراصل مغربی راستے ہی سے ممکن ہے۔ ذہن کی یہ بالادستی مشرق کے مطالعات پر حدود قائم کر دیتی ہے اور نتیجے میں مشرق کی ایک ایسی شکل ابھرتی ہے جو کسی حال میں بھی مغرب کے سامنے کوئی چیلنج پیش نہیں کر سکتی۔ (۱۵)

واضح ہوا کہ پس نوآبادیاتی مطالعہ اس امر پر دال ہے کہ بیرونی حکومتیں نہ صرف یہ کہ دور حکم رانی میں ذہن و دماغ کو متاثر کرتی ہیں بل کہ حکم رانی کے خاتمے کے بعد بہت سارے ایسے دیرپا اثرات چھوڑ جاتی ہیں جن سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، پھر نسلی امتیازات کی جو لکیریں واضح

طور نظر آتی ہیں اُس کی بھی وجہ یہ ہے کہ ذہن و دماغ آج تک اس فرق کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جو سفید ہیں وہ سیاہ کے مقابلے میں اہم تر ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں: ”ہندوستان کے تناظر میں انگریزوں کی خدمات پر نگاہ ڈالی جائے تو بالائی سطح پر یہی کہا جائے گا کہ انگریزوں نے بہت سارے معاملات میں ہماری آنکھیں کھول دیں، نئے علوم کے دروازے وا کیے، نئی زندگی کے اسباق سکھائے، نئے دلوں سے ہم کنار کیا۔ ممکن ہے یہ بات جزوی طور پر درست ہو لیکن کیا اس امر سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ آزادی کے اتنے عرصے بعد ڈینی غلامی کا طوق ہم اپنی گردن سے نکال کر پھینک نہ سکے اور احساس کمتری کا جو انداز رہا وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے بل کہ ایسے رجحانات کو تقویت مل رہی ہے۔“ (۱۶)

لیکن اب پس نوآبادیات کی پوری بحث مابعد جدیدیت کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔
آنیالونبانی نے اپنی کتاب میں لکھا:

”Arif Drilik نے نوآبادیات کو مابعد جدیدیت سے ہم رشتہ کیا ہے، نہ صرف یہ کہ مابعد جدیدیت کا تاریخ اور ثقافت کے نئے احسانات کے تحت جنم ہوا ہے بلکہ یہ تیسری دنیا کی ثقافتی صورت کی وجہ سے وجود پذیر ہوئی ہے۔۔۔۔۔ ”تین دنیا کی تھیوری“ ایک مابعد جدید نقطہ نظر رکھتی ہے اور یہ ریڈیکل مارکسزم سے فکراتی ہے۔“ (۱۷)

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو تیسری دنیا یا کچھڑے ہوئے ایشیائی، افریقی، لاطینی امریکی، یا وسط ایشیائی ممالک جن میں ہندوستان بھی ہے، ان سب کی حیثیت موجودہ دور سے پہلے انسانی سماج کے دوسرے یعنی Other کی تھی، ان کی ثقافت، ان کے ادبی ڈسکورس اور ان کے تشخص پر توجہ مابعد جدیدیت دور کا کارنامہ ہے۔ (۱۸)

دیوندراسر لکھتے ہیں:

”..... مابعد جدیدیت جو جرمنی میں نطشے، ہسرل اور ہائیڈگر سے شروع ہوئی، فرانس میں

لیونار، مشمل فو کو، رولاں ہارتھ، ژاں بودریلا اور دریدا سے ہوتے ہوئے پال دیمان کے ساتھ سفر کرتی امریکی جامعات میں داخل ہو گئی اور پھر مشرق کے ممالک میں بھی بحث کا موضوع بن گئی تیسری دنیا کے ممالک میں مابعد جدیدیت نے گیٹ کریش کرنا شروع کر دیا تو ان ممالک کے دانشوروں میں ایک فکری انتشار کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ کسی نے اس کا پر جوش استقبال کیا، دوسرے نے اس کی مذمت کی بعض نے اسے نیا فیشن یا فیڈ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو بعض نے اسے نئی فکر کا رتبہ دے کر سنجیدگی سے اس کا مطالعہ اور محاسبہ کیا۔ کچھ نے اس کی ترمیم شدہ ورژن پیش کی تو کچھ نے اسے ہندوستانی حیثیت عطا کرنے کی کوشش کی اور پھر تمام الفاظ اور محاورات کبھی پرانے اور کبھی نئے، اور کبھی بدلی ہوئی شکل میں استعمال میں لائے جانے لگے۔ مغرب، مشرق، جدیدیت، روایت، گلوبلائزیشن، قومیت، نواستعماریت، پس نوآبادیت، نوسرمایہ پرستی اپنی پوری شدت سے اور وسعت سے مابعد جدیدیت کے حوالے سے ادب، فن اور علم کے دوسرے شعبوں میں ظاہر ہونے لگے۔“ (۱۹)

اکیسویں صدی میں اس مسئلے پر گفت کو ہونے لگی ہے۔ 1990ء یا 2000ء کے بعد کی شاعری یا فکشن میں پس نوآبادیات دکھائی دینے لگا ہے۔ لوگ اپنے وطن، اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کو پھر سے یاد کرنے لگے ہیں مثلاً اردو کے ایک مشہور شاعر منور رانا کے خیالات ملاحظہ ہوں:

”ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی شاعری میں بخش کے امریکہ کی جگہ ملی جلی
آبادی والے اس گاؤں کا تذکرہ کریں، جہاں آج بھی ایک بیٹی کی رخصتی
کے درد کو پورا گاؤں محسوس کرتا ہے۔ گاؤں کے کسی بزرگ کے انتقال پر بیشتر
گھروں کے چولھے سارا دن آگ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔“ (۲۰)

اس کے علاوہ موجودہ دور کے تنقید نگاروں کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اردو ادب اپنے پرانے ورثے کو اہمیت دینے سے گریز کر رہا تھا۔ مغربی تصورات اور مغربی ادب سے واقفیت رکھنا اچھی بات ہے، ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ہر ادب کی روایت رہی ہے۔ ادب،

ادب ہوتا ہے، اسے کسی زبان، ملک یا قوم کے دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مغربی افکار کا اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شعریات کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمان فاروقی رقم طراز ہیں:

”یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا مغربی شعریات ہمارے کلاسیکی ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی نہیں؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ مغربی شعریات ہمارے کلام میں معاون ضرور ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی شعریات سے تعاون حاصل کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے لیکن یہ شعریات اکیلی ہمارے مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اگر صرف اس شعریات کو استعمال کیا جائے تو ہم اپنی کلاسیکی ادبی میراث کا پورا حق ادا نہ کر سکیں گے اور اگر ہم ذرا بد قسمت ہوئے، یا عدم توازن کا شکار ہوئے تو مغربی شعریات کی روشنی میں جو نتائج ہم نکالیں گے وہ غلط، گمراہ اور بے انصافی پر مبنی ہوں گے۔“ (۲۱)

اب ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی داستانوں اور مثنویوں کو غلط تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ انھیں سطحی اور رو مانیت سے تعبیر کر کے اپنی ثقافتی جڑوں سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ لوک قصے، کہانیاں، لوک گیت یہ سب ہمارا ثقافتی ورثہ ہے۔ ہر زبان و ادب کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ اگر اسے اسی نظام کا زائدہ تصور کریں تو اس کی اہمیت از خود واضح ہو جاتی ہے اور اس کی ساری خصوصیات نمایاں ہو کر نظر آنے لگتی ہیں۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

”تب ہمیں اپنی غزل نیم وحشی ہرگز نہیں معلوم ہوگی، ہمارا محبوب، زندگی سے عاری نظر نہیں آئے گا، فراق و وصل کی کیفیت بے معنی نہیں ٹھہرے گی۔ ہماری تشبیہیں، استعارے اور ہماری دوسرے بلاغت اور عروضی نظام بیکار محض ہیں، نہ معلوم ہوں گے اور یہ بھی احساس ہوگا کہ سنسکرت بھی تو ہماری وراثت تھی، تو اس سے فائدہ ہم نے کیوں نہیں اٹھایا، اس کے رسوں کے نظام پر

ہماری توجہ کیوں نہیں گئی، یعنی ہم نے اپنی مٹی ہی کی خبر نہیں رکھی اور ظاہر ہے
اسی مٹی نے ہمارا خمیر مرتب کیا ہے۔“ (۲۲)

متذکرہ بالا مضمرات و ممکنات کی روشنی میں مجموعی جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ
آزادی کے بعد بھی ہم ڈہنی طور پر انگریزوں کے غلام ہیں۔ انگریز یہاں کے لوگوں کو ڈہنی، سیاسی،
سماجی، نظریاتی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی طور پر کھوکھلا کر گئے ہیں۔ اب انھیں ان کی غلامی سے باہر نکل
کر مقامی روایت و تہذیب کی بات کرنا ہوگی۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

- (۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تنقحات - ص ۱۱، ۲۰۰۹ء، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
- (۲) ایضاً
- (۳) ایضاً - ص ۱۶-۱۵
- (۴) ڈاکٹر عبدالباری، بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ - ص ۱۳۰-۱۳۱ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- (۵) Edward Syed 1978 "Orientalism" pg.107 Vintage Books, USA
- (۶) ماہنامہ اردو دنیا جنوری، ۲۰۱۳ء، ص ۵۸، نئی دہلی
- (۷) POST-COLONIALSIM, A Guide for the perplexed, Pg.1 by Pramod K.Nayar
- (۸) ابولکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص ۶۳، ۲۰۰۷ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- (۹) ماہنامہ اردو دنیا جنوری، ۲۰۱۳ء، ص ۵۷، نئی دہلی
- (۱۰) عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۳۰۱، ۲۰۰۳ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- (۱۱) ششماہی فکر و تحقیق (جنوری تا جون ۱۹۹۸ء)، مدیر جمید اللہ بھٹ، نئی دہلی
- (۱۲) ڈاکٹر نفیس بانو، تہذیب الاخلاق - تحقیقی و تنقیدی مطالعہ - ص ۱۱۱، ۱۹۹۳ء، نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد
- (۱۳) Edward Syed 1978 "Orientalism pg.350 Vintage Books, USA
- (۱۴) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات - ص ۱۱۲، ۲۰۰۵ء، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی

(۱۵) ایضاً ص ۱۰۸

(۱۶) ایضاً ص ۱۱۵

Ania Loomba 1993 "Culture and Imperialism" Pg.246 Vintage Books, USA (۱۷)

(۱۸) گوپی چند نارنگ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ۔ ص ۷۴، ۱۹۹۸ء، اردو اکادمی دہلی

(۱۹) گوپی چند نارنگ، (مقالہ) مابعد جدیدیت: مغرب اور مشرق میں مکالمہ (مشمولہ) اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ۔ ص ۱۱۰-۱۱۱، ۱۹۹۸ء، اردو اکادمی دہلی

(۲۰) شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز۔ ص ۱۰-۹، ۲۰۰۶ء، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ص ۹-۱۰

(۲۱) ایضاً ص ۲۰

(۲۲) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات۔ ص ۳۷، ۲۰۰۵ء، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی

